جامعہ اسلامیہ کا نصب العین علوم اسلامیہ کا تحفظ اور اشاعت و تبلیغ، طلبہ کو ایسے انداز سے تربیت دینا ہے کہ وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہو سکیں۔ ان میں ایسی وسعت نظر پیدا کرنا ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی روح اور طریق کار کو سمجھنے کے بعد اسلام کی دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق ترجمانی کر سکیں۔ یہ ایک ایسا علمی ادارہ ہے جس کا مقصد سیاست سے بلند رہ کر تحقیق اور خدمت دین میں مصروف رہنا ہے۔ اس ادارہ میں بفضلہ تعالیٰ ایک ایسا علمی ماحول بروئے کار آ رہا ہے جس میں طلبہ کی ذہنی، علمی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا کام نہایت آسانی سے سرانجام پا سکتا ہے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہے کہ یہ ادارہ وسیع المطالعہ، بالغ النظر، سچے مسلمان اور سچے پاکستانی علماء پیدا کرے۔

ڈاکٹر بلگرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبدالقدوس صاحب

پشاور یونیورسٹی میں دینی تعلیم

آج سے صدی ڈیڑھ صدی پہلے جب انگریزی حکومت کے قدم ابھی اس ملک میں مضبوطی سے جمے نہیں تھے۔ یہاں دینی علوم کا رواج تھا۔ علوم کے سلسلے میں دینی اور دنیوی کی تقسیم جیسے آج ہے۔ اس وقت یہ تقسیم اس طرح نمایاں نہ تھی۔ تحصیل علم کی مجتمع کوشش میں معاشرہ یکساں شریک تھا۔

دینی علوم سے کسی حد تک بہرہ ور ہونا سوسائٹی کی ہر مثقف شخصیت کے لئے ضروری تھا۔ اس سے آگے ہر شخص اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق ایک شعبہ میں تخصص حاصل کرلیتا تھا۔ اور اس تخصص کی بنا پر شہرت کے مقام پر پہنچتا تھا۔

۱۸۲۵ء تا ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ مملکت ہند کے سرکردہ اہل کاروں کے نام تلاش کیجئے۔ آپ کو مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم کی طرح بہت سی شخصیتیں ایسی نمایاں نظر آجائیں گی جو ویسے تو حکومت کی وقتی خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ لیکن تعلیم اور ثقافت کے لحاظ سے ان کی تربیت دینی پس منظر میں ہو چکی تھی۔

اس یکسانیت کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تو مسلمان ہندو بھی اسلامی تہذیب کے نمایاں خدوخال سے کافی واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔

مولوی عبدالحق (مرحوم) لکھتے ہیں کہ۔

"ہندو مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے بات بات میں فارسی امثال اور جملے سعدی و حافظ۔ رومی جامی یا خسرو کے اشعار بے ساختہ زبان سے نکل جاتے تھے"

گلستان بوستان۔ دیوان حافظ۔ یوسف و زلیخا۔ سکندر نامہ اور شاہنامہ کا پڑھنا قومی شعار ہو گیا تھا۔ مدرسوں ہی میں نہیں ہر گھر میں یہ کتابیں نظر آتی تھیں۔ اس وقت کے کسی ہندو مصنف کی کتاب اٹھا کر دیکھئے وہی طرز تحریر اور وہی اسلوب بیان ہے۔ ابتدا میں بسم اللہ

لکھتا ہے۔ حمد و نعت و منقبت سے شروع کرتا ہے۔ شرعی اصطلاحات تو کیا حدیث و نص قرآن تک بے تکلف لکھ جاتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی نہیں۔ قومی یگانگت میں تہذیب و ذوق کی یکسانیت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔

مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کی رپورٹ ہے۔ کہ

> قلعۂ معلّٰی میں عجیب ماجرا تھا۔ کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرۃً ہمدردی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (اسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے"

(مرحوم دہلی کالج ص۲۲ و ص۲۰)

یہ دراصل ہماری اس ملک میں صدیوں کی تاریخ کی اس گرتی ہوئی عمارت کی آخری نشانیاں تھیں جس کی دیواریں متزلزل ہو چکی تھیں۔ اور ابھی ان کا گرنا باقی تھا۔

انگریز نے اس نظام کو بدلنا چاہا تو اس کی تبدیلی میں حکمت عملی سے کام لیا۔ اس ملک میں ایسے ادارے جن کے نصاب میں قدیم علوم شامل تھے۔ لیکن ان علوم میں سے زور اس حصے پر دیا گیا۔ جس کا تعلق دین کی مہارت اور دینی تربیت سے بہت کم تھا۔

اس کی ایک مثال دہلی کالج ہے۔ یہ کالج جو نواب غازی الدین مرحوم کے مدرسہ کی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں اس کی ابتدائی تنظیم صرف عربی و فارسی کی تعلیم سے ہوئی۔ اور ۱۸۲۸ء میں اس میں انگریزی کا اضافہ کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ دوسرے علوم بڑھا دیئے گئے۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ ۱۸۲۵ء میں اس کے نصاب عربی میں کیا کیا کتابیں شامل تھیں۔ تاہم اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۴۳ء میں عربی کے شعبے کے اعلیٰ درجے کا نصاب حسب ذیل تھا۔

مقامات حریری (مقامہ ۲۵ سے آخر تک) ھدایہ (کتاب الاقرار سے آخر تک) ریاضی (اقلیدس کے چار مقالے) تاریخ تیموری اردو تمام۔ رقعات ابو الفضل، کتاب حساب کی پہلی اور دوسری فصل۔

(مرأۃ الاقالیم)

اس قسم کے ملے جلے نصاب میں وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے۔ ان نصابوں کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ان میں قرآن و حدیث کا وجود نام کو نہ تھا۔ فقہ اور معقولات کی کتابیں شامل

کی گئی تھیں۔ فقہ میں اس وقت کی عدالتی ضروریات پیش نظر رہی ہوں گی۔ اور معقولات سے ایک طرف ذہن کی جلا مقصود ہوگی۔ تو دوسری طرف یہ کہ جب طلبہ پر اس ماحول میں جدید علوم کا دروازہ کھلے گا۔ تو وہ ان قدیم علوم سے خود ہی تنفر کا اظہار کریں گے۔

اس کالج کے اساتذہ میں مولانا مملوک العلی صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ان کے معصر دوسرے اکابر کے استاد رہے ہیں۔ ہمارے معاصرین اور ہمارے اساتذہ میں سے اکثر کی سند حدیث میں ان کا نام آتا ہے۔ مولوی کریم الدین صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> مدرس اول مدرسہ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی پر بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مدرسہ میں مقرر ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہئے ویسی نہیں ہوئی کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں۔ اور واقعہ میں بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم و فن میں جو ان زبانوں میں ہے مہارت تامہ حاصل ہے۔ اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اسکے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے۔ گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے۔ اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتیٰ الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کبھی کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔ بندے کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے۔ گویا اسکو حفظ کر رکھی ہے۔
>
> اس لئے رات دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلبہ پڑے رہتے ہیں ہر وقت انکو گھیرے رہتے ہیں۔ اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی کو انکار نہیں کر سکتے۔ سب کو پڑھاتے ہیں۔ عمر ان کی سنہ ۱۸۴۷ء میں ساٹھ برس کی ہو گی۔ بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول اور دو مقالہ آخر گیارہویں اور بارہویں کا کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے۔ اصل وطن ان کا نانوتہ ہے۔ مدت سے شاہ جہان آباد میں رہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے مستن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو

میں کیا تھا۔"

کچھ ایسی ہی حالت اس سے قبل کلکتہ مدرسہ کی بھی رہی جو وارن ہسٹنگز کے عہد میں ۱۷۸۱ء میں سرکار کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت ابھی دفتر فارسی میں تھا۔ اس مدرسہ کے قیام کا مقصد مسلمان بچوں کو عربی فارسی میں اسلامی فقہ سکھانا اور ان کو دفتری عہدوں کے لئے مستعد بنانا تھا ۱۷۹۱ء میں اس کے نصاب میں طبیعیات۔ عقائد۔ فقہ۔ ہیئت اقلیدس۔ حساب۔ منطق۔ صرف و نحو اور معانی داخل نصاب تھے۔ (تفسیر اور حدیث کا ذکر نصاب میں بالکل نہیں) تقریباً پچاس سال تک یہ مدرسہ اپنا ابتدائی مقصد پورا کرتا رہا۔ جب ۱۸۳۵ء میں انگریزی نظام تعلیم رائج ہوا اور ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو نے لی تو مدرسہ سے وہ مقصد حاصل ہونا بھی ختم ہوا۔ اور مدرسہ قدیم طرز پر ایسا نصاب پڑھاتا رہا جو نہ قومی مقصد کو پورا کرتا تھا اور نہ سرکاری مقصد کو۔

۱۸۵۰ء میں مدرسہ میں انگریزی، عربی، انگریزی و عربی مشترک اور بنگالی چار شعبے قائم کئے گئے تھے۔ نصاب کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ بہرحال قرآن و حدیث کا ان میں ذکر نہیں۔ ۱۸۷۱ء میں مدرسہ کے نصاب میں مندرجہ ذیل علوم شامل تھے۔

صرف، منطق، معانی، فقہ، ادب۔ تاریخ۔ فرائض اور فارسی (تفسیر و حدیث کا بالکل ذکر نہیں)

اورینٹل کالج لاہور کا قیام ۱۸۷۰ء میں ہوا۔ وہاں بھی اس وقت نصاب کا یہی عالم تھا۔ مولوی۔ مولوی عالم اور مولوی فاضل تینوں درجوں میں قرآن کریم اور تفسیر حدیث کی کوئی کتاب شامل نہیں کی گئی۔ اس وقت امتحان کا نصاب حسب ذیل تھا۔

(۱) امتحان مولوی (یعنی ادنیٰ عربی)

ھدایۃ النحو۔ پنج گنج۔ کافیہ۔ کلکتہ فسٹ آرٹسٹ کورس عربی۔ سنین الاسلام۔ الف لیلیٰ (۴۰ شب اول) شرح تہذیب۔ سراجی (یا کتاب المواریث من شرائع الاسلام واسطے شیعوں کے) عربی سے اردو میں اور اردو سے عربی میں پڑھنا اور اس کا مطلب بیان کرنا اور کچھ سوال زبانی متعلق صرف و نحو کے۔

(۲) امتحان مولوی عالم

شرح ملا اور شافیہ۔ تاریخ تیموری تا وفات تیمور۔ سبعۂ معلقہ۔ کلکتہ بی۔ اے۔ عربی کورس مختصر معانی۔ قطبی سلّم۔ شریفیہ شرح سراجی (یا کتاب المواریث من شرائع الاسلام واسطے شیعوں کے) اور معاملات قدوری۔ علم فقہ میں۔

اردو سے عربی میں اور عربی سے اردو میں جواب مضمون کسی آسان مطلب پر گفتگو
عربی میں کسی علم پر۔

(۳) امتحان مولوی فاضل

مطول (فن معانی تک) مقامات حریری۔ دیوان حماسہ۔ دیوان متنبی۔ عروض المفتاح۔
قاضی مبارک۔ حمد اللہ۔ رشیدیہ۔ (فن مناظرہ) صدرا۔ معاملات ھدایہ۔
جواب مضمون عربی زبان فصیح میں بہ نسبت درجۂ اوسط کے مشکل ہوگا۔ مباحثہ
علمی زبان عربی میں اور بیان بعضے مطالب کا مستند کتابوں سے۔ اور نثر سے۔

بعد میں ان مدارس کے نصاب میں تفسیر و حدیث شامل ہو گئے۔ مگر اس وقت جبکہ ان مدارس سے مسلمان عوام میں اتنی بددلی پھیل چکی تھی کہ مسلمان اہل علم ایسے مدارس کو مدرسہ کی بجائے مجہلہ کا خطاب دینے لگے تھے۔ جب سے ملک میں انگریزی زبان دفتری زبان بنی اور انگریزی "نظام تعلیم" سرکاری مقاصد کے لئے مقبول نظام تعلیم بنا۔ جگہ جگہ انگریزی سکول اور کالج کھلے۔ اور مسلمان چونکہ قدرۃً انگریزی نظام تعلیم سے دوری پسند کرتے تھے۔ اس لئے ان میں اس نظام کو مقبول بنانے کیلئے اسلامیہ سکول اور اسلامیہ کالج مسلمان رؤسا اور سرکردہ حضرات کی کوششوں سے قائم ہوئے نسبتاً اچھے وسائل معاش کے خواہشمند حضرات ان سکولوں اور کالجوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مگر چونکہ یہ ادارے سرکاری نظام تعلیم کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے اور سرکاری نظام میں دینی نصاب کے لئے کوئی مقام نہ تھا۔ اس لئے ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے حضرات دینی تعلیم سے بے بہرہ رہتے تھے۔ ان اداروں میں اکثر ایک یا دو عالم اس غرض کے لئے متعین ہوتے تھے کہ وہ سکول اور کالج کے طلبہ کو نماز روزہ وغیرہ مسائل سے روشناس کریں اور طلبہ کی دینی تربیت کا اہتمام کریں لیکن چونکہ مضمون پر پاس فیل ہونے کا کوئی توقف نہ تھا۔ عموماً ایسے استاد طالب علموں کے لئے چندوں سے تنخواہ وصول کرتے تھے اور ان کی تنخواہیں دوسرے مضامین کے اساتذہ کے مقابلہ میں معمولی ہوتی تھیں۔ اس لئے طلبہ پر ان اساتذہ اور ان کے مضمون کا اثر بہت کم پڑتا تھا۔

اہل علم کے زیر اثر مسلمانوں نے اپنی دینی تعلیم کا جائزہ لیا تو سرکاری اداروں میں اس کی حالت نہایت ناگفتہ بہ نظر آئی۔ اور ضرورت محسوس ہوئی کہ مسلمان اپنے طور پر دینی تعلیم کے نظام کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لئے دار العلوم دیوبند۔ مظاہر العلوم سہارنپور۔ مدرسۂ فرنگی محل اور دیگر اس قسم کے قدیم طرز کے مدارس وجود میں آئے۔ اور اس طرز نے مسلمانوں میں وہ مقبولیت حاصل کرلی کہ

سابق صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں ایسے مدارس ہر قصبہ اور ہر شہر میں قائم ہو گئے۔ برصغیر کے دوسرے صوبوں میں بھی اسی طرز کے کئی مدارس موجود تھے۔ قدیم طرز کے مدارس نے قدیم علوم کے ساتھ قدیم تمدن کے تحفظ کی بھی ذمہ داری لی اور انگریزی نظام تعلیم کے مطابق تربیت پانے والوں کی اکثریت نے نو وارد تہذیب کو جلد جلد قبول کرنا شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ ان مدارس دینیہ اور سرکاری مدارس کے تربیت یافتوں میں اختلاف علم و ثقافت کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔

قدیم و جدید کی اس کشمکش میں ہر فریق نے دوسرے فریق کے نقائص ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک کے ایک طبقہ کو مدارس دینیہ کے نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کا قیام اسی احساس کا مرہون منت ہے۔ اور ندوہ کے فضلاء نے قدیم و جدید (جنہیں علیگڑھ و دیوبند کے علامتی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے) کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لئے درمیانی کڑی کا کام دیا۔

سابق صوبۂ سرحد اس عمومی تمہید کو چھوڑ کر اب ہم انگریزی دور کے صوبۂ سرحد کی تعلیمی حالت پر تبصرہ کرتے ہیں۔

جہاں تک سرکاری (انگریزی) مدارس کا تعلق ہے اس صدی کی ابتدا میں یہاں ایک مشن سکول اور چند ایک سرکاری اور اسلامیہ ہائی سکول موجود تھے۔ ۱۹۱۰ء میں ایک مشن کالج بھی کھولا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں اسلامیہ کالج کا قیام دار العلوم اسلامیہ سرحد کے نام سے ہوا۔ اس دار العلوم نے (جس کی ابتدا مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے سے کی گئی تھی) صاحبزادہ عبد القیوم کی سرپرستی میں اور انکے بعد بھی سابق صوبۂ سرحد کے بہترین دماغوں کو تربیت دی۔ اور سول سروس کے لئے خصوصاً اور دوسرے سرکاری مناصب کے لئے عموماً قابل امیدوار تیار کئے۔

جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے۔ اس صوبے کا نظام وسطی ہند کے نظام سے الگ طرز کا تھا۔ یہاں ان علاقوں کی طرح مدارس کا وجود نہ تھا۔ گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں علماء اپنی اپنی مسجدوں میں بیٹھکر

---

(۱) مولانا غلام جیلانی صاحب کا مدرسہ پچھلی صدی میں موجود تھا۔ مگر غالباً وہاں بھی مدرس مولانا غلام جیلانی اکیلے ہی تھے جو اپنی مسجد میں (تالاب والی مسجد اندرون ڈیگری پشاور) میں درس دیا کرتے تھے چونکہ وہ خود جامع فنون تھے اس لئے تنہا ان کی ذات انجمن کا اور ان کا درس مدرسہ کا کام دیتا تھا۔ بعد میں جناب حاجی ترنگزئی صاحب نے کئی جگہ مدرسے قائم کئے۔ مگر چونکہ ان مدارس سے انگریز کو اپنے خلاف بغاوت کی بو آتی تھی۔ اس لئے ان کے مدرسین کو صرف جرم تدریس دینیات میں جیل جانا پڑا اور یہ مدرسے استبداد کے دباؤ میں بند ہو گئے

طلبہ کو حسبۃً للہ دینی علوم کا درس دیا کرتے تھے۔ اکثر یہ درس کسی ایک کتاب یا ایک فن کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا۔ جس عالم کے درس کی شہرت ہو جاتی تھی وہاں طلبہ ہجوم کی شکل میں رخ کر لیا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ روٹی کے ٹکڑوں سے صبح و شام اس ہجوم کی خدمت کر لیا کرتے تھے مدرس حسبۃً للہ ان کو پڑھایا کرتا تھا۔ ایسا اوقات ان کے لئے کتابیں مہیا کرتا تھا اور ان کی دوسری ضروریات میں بھی ان کی مدد کر لیتا تھا۔ یہ درس فنی مہارت کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ مگر ان میں کمی یہ تھی کہ ایک طالب علم بہ یک وقت کئی علوم کا استفادہ بہت کم کر سکتا تھا اور یکے بعد دیگرے علوم پڑھنے میں وقت بھی زیادہ صرف ہوتا تھا اور علوم کا باہمی توازن برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک فن کی تکمیل کے بعد دوسری جگہ جا کر دوسرے فن کی ابجد خوانی کرنا پڑتی تھی۔ اس مشکل سے نجات پانے کے لئے سابق صوبۂ سرحد کے طالبانِ علم نے ہند کا رخ کیا۔ دھلی۔ دیوبند۔ سہارنپور۔ بھوپال۔ رام پور۔ اجمیر۔ مراد آباد اور آس پاس کے دوسرے قصبات میں "ولایتی" (سرحدی) طالب علم بکثرت پائے جانے لگے۔ اس وقت صابق صوبۂ سرحد کے ہر قابل ذکر گاؤں میں دار العلوم دیوبند یا درسِ نظامی کے ان دوسرے مراکز کے فارغ التحصیل علماء موجود ہیں۔ چند ایک اصحاب ایسے بھی ہیں جنہوں نے ندوہ میں رہ کر علوم دین کی سند حاصل کی۔

مدرسۂ دینیات اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی

قیام پاکستان کے وقت سابق صوبۂ سرحد کی یہ حالت تھی کہ انگریزی نظامِ تعلیم کے لئے سکول اور کالج بکثرت موجود تھے اور دینی نظامِ تعلیم کے لئے یہاں کوئی قابل ذکر درسگاہ نہ تھی۔ نہ سرکاری اور نہ ایسی جو عوام کے چندوں سے چلتی ہو (باستثنائے دار العلوم بھانہ ماڑی کے جو ابھی اپنے آخری دن گذار رہا تھا اور ہند کے مدارس کے ساتھ آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع تھا۔ اس لئے قوم کی طرف سے تقاضا ہوا کہ ملک کی دینی ضرورتوں کے لئے ایک دینی درسگاہ (سابق صوبۂ سرحد میں) قائم کی جائے۔ اس تقاضا کے جواب میں اسوقت کی وزارتِ تعلیم و اوقاف نے قاضی نور الحق صاحب ندوی (ڈین اسلامیہ کالج و چیف خطیب) کی مساعی سے چار سالہ نصاب پر مشتمل ایک درسگاہ قائم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ نصاب جناب ندوی صاحب نے مولانا عبد الرحیم (مرحوم) کی مدد سے تیار کیا اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے اُسے پسند فرمایا۔

۱۹۴۹ء میں اس تجویز کو جامۂ عمل پہنایا گیا۔ اور مرکزی مدرسۂ دینیات کے نام سے ایک ادارہ اسلامیہ کالج پشاور کے ایک شعبہ کے طور پر قائم کیا گیا۔

عملی شکل میں آنے کے بعد اس ادارہ کے نصاب میں مزید ترمیم کی ضرورت پڑی۔ پہلے یہ تجویز تھی کہ ادارہ

علیحدہ اور مستقل ہوگا۔ اس وقت داخلہ کے لئے مڈل تک کی تعلیم بطور شرط تجویز کی گئی تھی۔ اجرا کے وقت تک پشاور یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی سامنے آچکی تھی۔ اس لئے اب یہ قرار پایا کہ داخلہ کے لئے میٹرک پاس ہونا شرط ہو۔ اور ایف اے اور بی۔ اے کی انگریزی چار سالہ نصاب میں علی الترتیب شامل ہو۔ جب ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کی آٹھ فیکلٹیوں میں سے ایک فیکلٹی اسلامک تھیالوجی کے نام سے موسوم کی گئی۔ اس فیکلٹی کے تحت اس ادارہ کے ابتدائی دو سالہ نصاب کو ایف۔ اے تھیالوجی اور آخری دو سالہ نصاب کو بی اے تھیالوجی کے امتحانوں کا نصاب قرار دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں ایف۔ اے تھیالوجی کا پہلا امتحان اور ۱۹۵۳ء میں بی۔ اے تھیالوجی کا پہلا امتحان منعقد ہوا۔ اور اس ادارہ کے فارغ التحصیل حضرات نے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کر لی۔ ایف۔ اے کا یہ سرٹیفکیٹ اور بی۔ اے کی یہ ڈگری دوسری ڈگریوں کے ساتھ بالکل مساوی تسلیم کی گئی۔ ڈگری یافتہ حضرات میں سے اکثریت تو ٹریننگ کالج میں بی ٹی کی ڈگری کے لئے داخل کی گئی۔ دو چار نے ایل ایل بی پاس کیا چند ایک نے مختلف شعبوں سے ایم۔ اے کر لیا۔ اور کافی تعداد ایسی ہے جنہوں نے سکولوں میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد عربی یا اسلامیات میں ایم۔ اے کر لیا۔

اس ادارہ کا نصاب حسب ذیل تھا۔

ایف اے قرآن کریم و حدیث۔ فقہ۔ عربی۔ اسلامی تاریخ۔ انگریزی۔ جنرل سائنس (طبیعیات کیمیا۔ نباتیات۔ حیوانیات۔ زراعت سے متعلق عام معلومات)

بی اے قرآن کریم و تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اصول تفسیر۔ اصول حدیث۔ اصول فقہ۔ تینوں علوم کی مختصر تاریخ۔ عربی۔ بلاغت۔ تاریخ۔ انگریزی اور منطق (استقرائی و استخراجی)

وظائف اس ادارہ میں طلبہ سے فیس (ماہوار فیس) نہیں لی جاتی۔ رہائشی کمرہ کا کرایہ معاف ہے۔ اور اخراجات کے لئے ساٹھ وظیفے تیس تیس روپیہ ماہوار کے مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ پندرہ بیس طلبہ کو سرکاری اور قبائلی وظیفے مل جاتے ہیں۔

مقاصد ادارہ کے لئے اس نصاب اور اس طریق کار (اسلامیہ کالج کا جزو بنانے اور ڈگریاں تسلیم کرنے) میں مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر تھے۔

(۱) قدیم طرز کے علماء پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ وہ جدید علوم سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ (پچاس میں سے ۵۵ نمبر اور سو میں سے ۱۰۵ نمبر دینے کے لطیفے ان کے بارے میں اب بھی مشہور ہیں) میٹرک تک کی تعلیم شرط قرار دینے سے اعتراض کافی حد تک اٹھ جاتا ہے۔

(۲) یہ خدشہ تھا کہ میٹرک کے بعد مزید چار سال لگا کر بھی اگر اس ادارہ کے فارغ التحصیل کو ملازمت نہ مل سکی تو وہ علم دین سے بددل ہو گا۔ اسناد کے تسلیم کئے جانے سے یہ خدشہ ختم ہو گیا اور اب تمام فارغ التحصیل کسی نہ کسی رنگ میں ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آڈٹ کے دفتر میں، پی ایم اے میں اور محکمۂ مواصلات میں بھی اس ادارہ کے فارغ التحصیل اس وقت کام کر رہے ہیں۔

(۳) انگریزی دور کی افتراق انگیز تعلیمی پالیسی سے ارباب حکومت اور علماء کے درمیان میں جو خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اس ادارہ کے وسیلہ سے اُسے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ادارہ کا طالب علم جب کالج کے دوسرے طلبہ کے ساتھ یکساں طور پر ہاسٹل کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کھیلوں میں حصہ لیتا ہے کالج کی سوسائیٹیوں میں یکساں عہدے حاصل کرتا ہے۔ مباحثوں میں شریک ہوتا ہے تو نشست و برخاست کی وحدت کے ساتھ فکری یگانگت کے لئے بھی راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اسی لئے اس ادارہ کے طالبعلموں پر یہ پابندی ہے کہ وہ کالج کے ہاسٹلوں میں رہائش پذیر ہو کر امداد کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چند سالوں سے پشاور یونیورسٹی سوشل ورک (خدمت خلق) کے جس پروگرام کو چلا رہی ہے۔ اور گذشتہ جنگ کے دوران میں یونیورسٹی کے طلبہ نے جو خدمت انجام دی (ان دونوں پروگراموں میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب محمد علی صاحب نے خاص دلچسپی لی ہے) ان خدمات میں اس ادارہ کے طالبعلم بھی کالج کے دوسرے طلبہ کے ساتھ شانہ بشانہ شریک تھے۔ اور دوسرے طلبہ کے ساتھ ان میں سے بھی کئی اصحاب نے مریضوں کے لئے خون کا عطیہ دینے میں سبقت سے کام لیا ہے۔

(۴) ادارہ کو میہ کالج کے عظیم الشان کتب خانے سے جو پاکستان کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ استفادہ کا موقع ملا۔ اور طالب علموں کی اکثریت کا دورانِ تعلیم میں ہی ذوقِ مطالعہ بڑھ گیا۔

مدرسۂ دینیات اپنے قیام کے وقت نصاب اور طریق کار کے لحاظ سے دنیا بھر کے دینی اداروں میں اپنے طرز کا منفرد ادارہ اور قدیم و جدید کے امتزاج کا خوش آئند تجربہ تھا۔ اس ادارہ کا قیام پشاور یونیورسٹی کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

عمومی سرکاری مدارس کی دینی تعلیم

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے سرکاری درسگاہوں کے باقاعدہ نصاب میں دینی تعلیم کی جگہ نہ تھی اور جو خارج از نصاب پرائیویٹ انتظام تھا وہ بے حد ناقص تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سابق صوبۂ سرحد کی یہ خصوصیت تھی کہ وہاں کے محکمۂ تعلیم نے جناب قاضی نور الحق صاحب کی سفارش اور اس وقت کی وزارت کی ہدایات کے ماتحت ۱۹۵۲ء سے

مڈل تک کی جماعتوں میں دینیات کی تعلیم لازم کر دی تھی اور ½ پارہ ترجمہ قرآن کریم کے علاوہ عقائد عبادات اور اخلاق سے متعلق کافی مواد طلبہ کو بہم پہنچایا جاتا تھا۔ جو طالب علم دینیات میں پاس نہ ہوتا وہ فیل متصور ہوتا تھا۔ یونیورسٹی نے میٹرک کے امتحان کے لئے یہ مضمون اسی طور پر منظور کر دیا تھا کہ پڑھنا تمام سرکاری سکولوں میں لازم اور اس میں پاس ہونا ڈویژن کے لئے مفید ہو۔ امتحان کے چھ دوسرے مضامین کے ساتھ یہ ساتواں برابر کا مضمون دو پرچوں پر مشتمل تھا اور طلبہ ممتحنوں کی رپورٹ کے مطابق نمبر وصول کرنے کی خاطر اچھی خاصی محنت کے عادی ہو گئے تھے۔

تعلیمی کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد ملک بھر میں ایک قسم کی جوتا توی تعلیم رائج کر لی گئی۔ اس میں پشاور کے حلقہ کو دینی تعلیم کے رواج کے سلسلہ میں یہ قربانی دینا پڑی کہ مڈل کا نصاب دینیات سابق نصاب کی بہ نسبت کمزور ہو گیا۔ اور میٹرک سے لازمی دینی تعلیم کی شرط اڑ گئی۔ پھر سائنس کے طلبہ پر دینی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا اور آرٹس کے طلبہ میں سے صرف وہ طالب علم جو دوسرے مضامین میں اسلامیات کو ترجیح دینا چاہتے تھے دینی تعلیم (اسلامیات) کو بطور مضمون اختیار کر سکتے تھے۔ ایف اے اور بی اے میں اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے پہلے یہ مضمون اختیاری تھا۔ ہر طالب علم اسے اختیار کر سکتا تھا۔ یکساں نظام تعلیم کے بعد ایف اے میں سائنس کے طلبہ پر یہ دروازہ بند ہو گیا اور آرٹس کے صرف وہ طلبہ اسلامیات کا مضمون (انتخابی) لے سکتے ہیں جو دوسرے مضامین پر اسے ترجیح دیں ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک یہی حالت رہی۔

خدا کا شکر ہے کہ اب حکومت کی ہدایات کے ماتحت میٹرک میں دینی تعلیم لازم ہو گئی ہے اور ملک بھر میں ۱۹۶۸ء میں میٹرک کا امتحان دینے والے طالب علم کے لئے دینیات کا امتحان بھی دینا لازم ہو گا۔

دینی تعلیم کے بارے میں یونیورسٹی کا جدید مستحسن اقدام

اس سال جناب محمد علی صاحب وائس چانسلر نے دینی تعلیم کو فروغ دینے اور طالب علموں کی عمومی دینی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مزید قدم اٹھایا ہے۔ انہوں نے قاضی نور الحق صاحب ندوی صدر شعبۂ امور مذہبی کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اور ہدایت دی کہ تمام ڈگری (آرٹس اور سائنس) کالجوں کے علاوہ پروفیشنل کالجوں کے لئے بھی دینی تعلیم کا ایک نصاب تیار کیا جائے اور انکے ایما پر سنڈیکیٹ نے یہ تجویز کی ہے کہ مندرجۂ بالا اداروں کے تمام امتحانوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم بھی شامل ہو۔

کمیٹی نے اس مقصد کے لئے نصاب تیار کر لیا ہے۔ اور جب وہ ہر ایک فیکلٹی کے بورڈ آف سٹڈیز کی طرف سے منظوری حاصل کرے گا۔ تو غالباً اسی سال سے اس کا نفاذ ہو جائے گا۔ پروفیشنل کالجوں میں میڈیکل کالج۔ انجینئرنگ کالج۔ کالج آف ایگریکلچر۔ کالج آف کامرس۔ کالج آف ہوم اکنامکس اور کالج آف ایجوکیشن) میں دینی تعلیم کا اجرا پشاور یونیورسٹی کی پہل ہے جس کا تتبع انشاء اللہ دوسری یونیورسٹیاں بھی کریں گی۔ اور اسی کوشش کے لئے مندرجۂ بالا دونوں حضرات خصوصی طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔

شعبۂ اسلامیات

سنہ ۱۹۵۲ء میں یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں ایم اے کی کلاسیں کھول دی گئیں۔ مصر سے ایک فاضل پروفیسر کی خدمات مستعار لی گئیں۔ چار سال تک اس شعبہ میں داخلہ جاری رہا اور طلبہ میں اضافہ کی کوشش کی گئی۔ مگر طلبہ کی بے توجہی کی وجہ سے سنہ ۱۹۵۶ء میں شعبہ میں داخلہ بند کر دینا پڑا۔ (جو بعد میں سنہ ۱۹۶۳-۶۲ء میں دوبارہ جاری ہوا)

سنہ ۱۹۵۶ء میں شعبۂ اسلامیات کھولا گیا سنہ ۱۹۶۰ء تک اس شعبہ کے ایم اے میں داخلہ جاری رہا۔ مگر طلبہ کی تعداد ایک ایک اور دو دو سے آگے نہیں بڑھی اس لئے سنہ ۱۹۶۰ء میں اسے بھی بند کرنا پڑا۔ پھر نئے تعلیمی منصوبہ کے مطابق آنرز کی کلاسیں کھول دی گئیں سنہ ۱۹۶۲ء میں جب پہلی دفعہ چار طلبہ نے اسلامیات میں بی اے آنرز کیا تو انکی تعلیم کی تکمیل کی خاطر ایم اے کی کلاسیں دوبارہ کھل گئیں اور اس دفعہ داخلہ کی رفتار امید افزا رہی۔ چنانچہ اس سال سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ایم اے کی کلاسوں میں سال اول میں ۲۰ اور سال دوم میں ۱۵ طلبہ شعبۂ اسلامیات میں زیر تعلیم ہیں۔ طلبہ میں ایک ترکی کا باشندہ ہے جس نے الازہر کی کلیۃ الشریعہ میں دو سال تعلیم حاصل کی ہے۔

عزائم اور مشکلات

"اسلامیات کی تعلیم سے متعلق تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کی سفارش ہے کہ اسلامیات کے اساتذہ اور اہل علم کو چاہیئے۔ کہ وہ غیر جانبدارانہ روش کو اپنائیں موجودہ طبیعی اور اجتماعی سائنس کی روح اور طریق کار کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اسلام کی تشریح میں اس سے پورا پورا کام لیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ اسلامیات کے اساتذہ اپنے مضمون کے متنوع شعبوں کا پورا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ سوشل سائنس کے مضامین میں سے کسی بھی ایک مضمون مثلاً اقتصادیات۔ فلسفہ۔ نفسیات یا سیاسیات کی معیاری واقفیت رکھتے ہوں اور ان اجتماعی علوم کی روح اور طریق کار میں جو اصول کام کر رہے ہیں انھیں اچھی طرح جانتے ہوں"۔

آگے چل کر رپورٹ مزید سفارش کرتی ہے۔

"علمائے اسلام کے سامنے جو بڑا کام ہے وہ اسلام کی بنیادی اقدار کے علم اور موجودہ سائنس میں تناسب اور توافق پیدا کرنا ہے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کو سمجھے اس کی اقدار کا احترام کرے اور ان کے مطابق عمل کرے اس لئے جو طلبہ اور اساتذہ اسلامیات کو اپنا مخصوص مضمون بنانا چاہیں ان کو چاہیئے کہ ایک طرف وہ عربی زبان کی پوری اور گہری واقفیت پیدا کریں اور دوسری طرف وہ طبیعی اور اجتماعی علوم سے بھی ناآشنا ہوں تاکہ وہ طبیعی اجتماعی اور پے در پے پیش آنے والے عصری تقاضوں کی ایسی تعبیر کر سکیں کہ عملی زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا جواب ان کے ہاں سے مل سکے اور وہ اسلام کو اس طرح پیش کر سکیں کہ وسعت پذیر انسانی معلومات کی روشنی میں موجودہ عملی مشکلات کے لئے دنیا کو اسلام سے بروقت رہنمائی مل سکے"

ان دو اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامیات کے فارغ التحصیل عربی میں مہارت ہونا چاہیئے۔ اور سائنسی یا معاشرتی علوم میں سے کم از کم ایک مضمون کی گہری واقفیت اور قوت اجتہاد بھی ہونا چاہیئے قوت اجتہاد تو ہر شخص کے بس کی چیز نہیں وہ خدا کی دین ہے جسے مل جائے اس کا صحیح استعمال کر سکتا ہے۔ جس میں ملکۂ اجتہاد نہ ہو اور اجتہاد کی ہوس کا شکار ہو جائے وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے فتنہ بن جاتا ہے۔

دوسری دو باتوں کے بارے میں کمیشن کی سفارشات ایسی ہیں۔ جو موانع دور کرنے پر ہمارے بس میں آسکتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے طالب علم کو سوشل سائنس یا سائنسی علوم کم از کم ایک مضمون کا ماہر بنانا شروع کر دیں۔ عربی سے واقفیت ہمارے مدرسۂ دینیات کے طالب علم کو ہو جاتی ہے۔ اور جب ان میں سے ذہین طالب علم ایم اے کر لیتا ہے تو اس کی قابلیت مسلّم ہوتی ہے۔ مگر غربت ان کی تعلیم میں آڑے آتی ہے اور اکثر جب وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں تو روزگار کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ ایم اے میں داخلہ لینے والے اصحاب اکثر ایسے رہ جاتے ہیں جنہوں نے بی اے میں اسلامیات پڑھی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ عربی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس سال کے حالات نسبتاً امید افزا ہیں تاہم اگر مدرسۂ دینیات کے طلبہ کو مزید وظیفے مہیا ہو سکے تو ایم۔ اے میں پڑھنے والوں کا معیار باہمی مقابلہ اور تنافس کی بنا پر اور بڑھ سکے گا۔

سوشل سائنس کا کوئی مضمون یا سائنس کا کوئی اور مضمون شامل کرنا ممکن تو ہے لیکن اس ممکن کو

عمل میں لانے کے لئے بہت سے مراحل طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے سردست یہ تجویز تجویز ہی کی شکل میں ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ بی۔ ٹی۔ ایچ کے نصاب کو دو سالہ (پاس کورس) کے بجائے تین سالہ (آنرز) میں تبدیل کیا جائے اور اس طرح مزید مضامین شامل کرنے کی گنجائش نکالی جائے۔

بہرحال بی۔ ٹی ایچ کا موجودہ نصاب دینیات کی فنی تعلیم کے لئے بھی سردست ناکافی ہے۔ اور ضرورت ہے۔ کہ اس کورس کا طالب علم دو سال مزید لگاکر اپنی تعلیم کو ایم۔ اے کی حد تک بڑھا دے۔ اس سلسلے میں بڑی مشکل اخراجات کی ہے۔ بی۔ ٹی ایچ پاس کرنے والوں کی مالی حالت کمزور ہوتی ہے۔ اور ایم۔ اے میں داخلہ کے لئے سو ڈیڑھ سو روپیہ کی امکانی ملازمت سے صرف نظر کرکے ساٹھ ستر روپیہ ماہوار اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ اس لئے ان فضلاء کی اکثریت بہت جلد کسی ملازمت کی تلاش میں نکل جاتی ہے اور ان کی تعلیم نامکمل رہ جاتی ہے۔

وہ تعلیم کو آگے بڑھانے کی جرأت اس لئے بھی نہیں کرتے کہ اسلامیات ابھی ہماری زندگی میں پوری دخیل نہیں ہیں۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد بھی ایک فاضل دینیات کو آسانی سے روزگار ملنا مشکل ہوتا ہے۔ ایم۔ اے میں اول آئے فضلاء بھی مہینوں بے کار رہتے ہیں۔ یہ مشکل تب ہی حل ہوگی جب محکمۂ تعلیم ثانوی جماعتوں میں اسلامیات کے مدرس کے لئے تربیت یافتہ استاد (بی اے۔ بی ایڈ) ہونا اسی طرح ضروری قرار دے جس طرح انگریزی حساب اور معاشرتی علوم کے لئے ایسی صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے۔ انگریزی دور کی یہ تقسیم (جو ابھی تک ہمارے سکولوں میں رائج ہے) بہت ہی نامناسب ہے کہ انگریزی حساب اور تاریخ کو تو سکول کے ادنیٰ مضامین کی حیثیت دی گئی ہے اور قدیم یونانی و عربی علوم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اسلامیات اور مشرقی زبانوں کی حیثیت ان سے کم تر رکھی گئی ہے۔ اگر محکمۂ تعلیم ٹریننگ کالجوں میں اور سکولوں میں اسلامیات اور مشرقی علوم کی حیثیت کو دوسرے مضامین کے ساتھ برابر کر دے۔ تو ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے والوں اور دینیات کی تکمیل کرنے والوں کی کثرت ہو جائے گی۔

سب سے بڑی مشکل تربیت کی ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف دماغ کو روشن کرنا نہیں بلکہ کردار و اخلاق کی تہذیب بھی ہے۔ اسلامیات کی تعلیم کا نتیجہ طالب علم کے ذہنی رجحان اور اخلاقی بلندی کی شکل میں نمایاں ہونا ضروری ہے۔ مدرسۂ دینیات کے تجربہ سے مقصود یہ تھا کہ مجتمع ماحول میں رہ کر اسلامی

کردار کے حصول کی کوشش کی جائے۔ زندگی۔ اگر الگ تھلگ ماحول میں گذار دی جائے تو ذہن ایک خاص نہج کا تیار ہو جاتا ہے لیکن ایسے ماحول کے تربیت یافتہ افراد دوسرے طبقات کے ساتھ آسانی سے اختلاط قبول نہیں کرتے اور جب بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقعہ آتا ہے امیال وعواطف میں فریقین کا باہمی بعد نمایاں محسوس ہو جاتا ہے۔

مدرسۂ دینیات میں تربیت پانے والے حضرات سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلامیہ کالج کے دوسرے طلبہ کے ساتھ اختلاط رکھنے کے باوجود اپنا امتیازی دینی کردار برقرار رکھیں گے۔ یہ تجربہ بظاہر کامیاب نظر آتا ہے۔ تاہم قناعت توکل اور خدا پرستی کے جن اعلیٰ اوصاف کی ضرورت ہے اس مادّی ماحول میں ان کے پیدا ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق و اعانت کی ضرورت ہے۔ گذشتہ دس بارہ سال کا تجربہ ہمارے خیال میں کافی نہیں۔ ابھی اس میدان میں مزید جدوجہد اور محنت کرنے کے بعد پورے نتائج کے حصول کے لئے انتظار کرنا پڑیگا۔

جامعہ کا قیام

حضرت مولانا سیّد کرم شاہ صاحب ازہری بی۔ اے
سجادہ نشین بھیرہ

الٰہی بخش جاراللہ ایم۔ اے
لیکچرر

"معاشیات و سیاسیات کے متصادم نظریات نے انسانیت کے مستقبل کو تباہی اور مکمل بربادی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ کیا ہمارا فرض اولین نہیں کہ ہم اسلامی معاشی اور سیاسی نظریات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ آج صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ اسلام کا معاشی نظام عدل و انصاف پر اور اسلام کا سیاسی نظام انسانی شرف و مساوات پر مبنی ہے بلکہ ہمیں ان کے جملہ نظریات سے تقابل کر کے دکھانا ہوگا۔ مجمل سا تقابل نہیں بلکہ تفصیلی تقابل اور تجزیہ۔ تاکہ کسی منکر کے لئے مجال انکار باقی نہ رہے۔ لیکن اس تقابل کے لئے ان کے نظریات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ادھورا اور نا تمام مطالعہ نہیں بلکہ گہرا اور عمیق مطالعہ، تاکہ آپ کا قول ان کے علوم میں ان کے لئے بھی قول فیصل ہو۔ جس طرح آپ کے اسلاف کرام کا قول، قولِ فیصل ہوا کرتا تھا۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ علوم کے متعلق ہم تعصب اور تنگ نظری کی روش ترک کردیں اپنے طلباء کو، اپنے مستقبل کے مبلغوں کو فلسفہ و فکر کے معرکوں میں توحید کا پرچم لہرانے کی ذمہ داری قبول کرنے والوں کو ہم ان تمام علوم سے آشنا کردیں، انہیں بتادیں کہ یہ وہ امراض ہیں جنھوں نے انسانیت کو جاں بلب کر دیا ہے۔ تم نے ان کا درماں کرنا ہے۔ جاہلیت و بربریت کے عفریت ان خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں جن کو تم نے نیچا دکھانا ہے۔"

[redacted]